جلد ۱۰ شمارہ ۱۶، ۲۰۲۳

Article

Saqi Farooqi " Paap Beeti" A bold and unique autobiography

ساقی فاروقی کی "پاپ بیتی"، ایک بے باک اور منفرد خودنوشت

Dr. Rubina Shaheen*[1], Dr. Antal Zia[2]

[1] Professor, Department of Urdu, University of Peshawar

[2] Department of Urdu, SBBWU, Peshawar

*Correspondence: rubinauni@uop.edu.pk

[1] ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر انتل ضیاء[2]

[1] پروفیسر، شعبہ اردو، جامعہ پشاور، [2]شعبہ اردو، جامعہ شہید بینظیر بھٹو برائے خواتین، پشاور

Abstract: Autobiography is one type of biography, which tells the life story of its author, meaning it is a written record of the author's life. An autobiography is a written account of a person's life, narrated by the individual themselves. It is a form of memoir that provides a detailed and comprehensive record of the author's personal experiences, achievements, and reflections. Autobiographies typically cover significant events, relationships, and milestones in the author's life, presenting an intimate and subjective perspective. Saqi Farooqi is a prominent UK-based Urdu and English poet. He was born in Gorakhpur, Uttar Pradesh India in 1936. He was migrated to Bangladesh and then to Karachi and finally shifted to London where he died on 19th of January 2018. This Research Paper or Article is focused on the autobiography of Saaqi Farooqi "Paap Beeti"

Keywords: Paap, Autobiography, Biography, Narcissism, details, innovation, authentic, lifeblood, Urns, balcony, memory

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:02-06-2023
Accepted:18-06-2023
Online:30-06-2023

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

آپ بیتی ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں مصنف اپنے حالات زندگی کو بذاتِ خود قلم بند کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں سوانحی ادب اور یادداشت یا آپ بیتی کو الگ اکائی کی صورت میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔خودنوشت سوانح عمری کو ہم سادہ الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ سوانح عمری جو خود لکھی جائے جو کہ ایک مستند دستاویز ہوتی ہے، کیونکہ روداد حیات خود پر بیتنے والا بیان کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کے بیان کرنے والا واقعات کو مناسب تسلسل سے پیش کرتا ہے۔ خودنوشت سوانح عمری کی اہم خوبی یہ بھی ہے کہ لکھنے والا اپنے ظاہر اور باطن سے دوسرے تمام لوگوں کی نسبت زیادہ واقف ہوتا ہے، اس لیے صداقت اور سچائی کے بیانیے سے تسلسل قائم رہتا ہے۔ادب کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو سوانحی ادب کی اصطلاح کافی وسیع اصطلاح ہے۔ سوانحی ادب کی ابتداء کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی لکھتے ہیں کہ۔

"سوانحی ادب میں خودنوشت سوانح عمری کا لفظ تو ۱۸۰۹ء میں استعمال ہونا شروع ہوا، مگر جن خودنوشت سوانح عمریوں کا ذکر انگریزی ادب میں موجود ہے ان میں سینٹ آگسٹن (۳۵۰تا۴۰۳) کے "اعترافات" کو پہلی خودنوشت سوانح عمری قرار دیا جاتا ہے۔ اعترافات ۳۹۹ عیسوی میں لکھی گئی اور ان میں سینٹ موصوف کے بچپن کی منظر کشی، ماں کے پیار کا بیان، صداقت کی جستجو میں گناہ و ثواب کی کشمکش اور بلاآخر عیسائیت کی قبولیت کو بڑے دل نشین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ اعترافات صدیوں بعد بھی اس طرح مقبول سمجھے جاتے ہیں۔۔۔"[۱]

سوانحی ادب کی تین بنیادی قسموں توزک اور خود نوشت اور سوانح عمری میں باریک سا فرق موجود ہے ۔یاداشتیں لکھنے والے کو معروف اور مقبول شخصیت ہونا چاہیے، جس نے کسی خاص میدان میں کوئی خاص کارنامہ سرانجام دیا ہو اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکتا ہو۔ خودنوشت سوانح عمری لکھنا ایک دشوار کام ہے۔خودنوشت سوانح عمری کا لفظ ۱۸۰۹ء میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ انگریزی ادب میں خود نوشت سوانح عمریوں میں ابتدائی اور اہم نام سینٹ آگسٹن کے " اعترافات "کا ہے۔ اس میں آگسٹن کے بچپن کے حالات، ماں سے شدید لگاؤ، کائناتی صداقتوں کا بیان و جستجو اور عیسائی مذہب کو قبول کرنے کے واقعات کو بڑے جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے اور انہی وجوہات کی بنا پر یہ صدیوں تک مقبول رہنے والے اعترافات ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا میں خود نوشت سوانح عمری کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے۔

"Autobiography the biography of oneself narrated by oneself autobiographical work can take many forms from the intimate writings made during life that were not necessarily intended for publication (including letters, diaries, journals, memories and reminiscences) To a formal book length autobiography" 2

اسی طرح فرہنگ آصفیہ میں خود نوشت سوانح کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"سوانح عمری، اسم مذکر، سرگزشت کسی شخص کی زندگی کا حال، تذکرہ، کسی عالم خواہ فاضل، خواہ بڑے بڑے کام کرنے والے یا بہادر حاکم کے وہ واقعات جو اس کی عمر میں گزرے ہوں" ۳

خود نوشت لکھنے سے ایک عہد، ایک زمانہ صفحۂ قرطاس کے اندر سمو کر وقت کو قاری کے لیے محفوظ کر دیتا ہے۔ یہ جہاں ایک فرد کے کارناموں، حالات زندگی، مزاج اور عادات کی نمائندہ ہوتی ہے وہاں اس عہد اور زمانے کے مزاج کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ خود نوشت لکھنے سے ایک طرف مصنف کی زندگی کے افادی پہلو دوسروں تک پہنچانے کا سبب بنتے ہیں، تو دوسری طرف زندگی کی مختلف ناکامیوں اور کمزوریوں سے بھی دوسروں کو متنبہ کرنے کا ایک اچھا وسیلہ ملتا ہے۔ لیکن ایک کامیاب سوانح خود نوشت کے لیے ضروری ہے کہ لکھنے والے کا حافظہ قوی ہو، وہ ایک عمدہ اسلوب کا مالک ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا مشاہدہ اور تجزیہ عمیق ہو۔ پروفیسر پرویز پروازی کا کہنا ہے کہ

"خود نوشت کے فن میں کم از کم تین عناصر اہم ہیں۔ لکھنے والے کی یاداشت، لکھنے والے ن کا اسلوب اور لکھنے والے کے ارد گرد کا حلقہ رجال و احباب۔ ایک اور بات یاد رکھنے کی ہے کہ کم گوئی اور اخفائے ذات کے نتیجے میں حقائق کا اخفا بھی ہو سکتا ہے اور اکثر لوگ ایسی باتیں بیان کرنے کی جرأت نہیں کرتے جو ان کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہو۔" ۴

خود نوشت پر غور کیا جائے تو یہ اپنے آپ میں ایک مشکل فن ہے۔ انسان اپنی ذات کو بہت اہمیت دیتا ہے اور اپنی کمزوریوں کو بیان کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔ خود نوشت آپ بیتی لکھتے وقت مصنف انتہائی مشکل گھڑیوں سے گزرتے ہوئے اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کو بھی بیان کرتا ہے۔ اس لحاظ سے برٹرینڈ رسل نے خود نوشت میں بہت جدت رکھی ہے، انہوں نے اپنی زندگی کے وہ پہلو بھی بیان کیے ہیں جنہیں خلق خدا تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ہمارے ہاں جوش

ملیح آبادی نے ۱۸ معاشقوں کو اپنی خود نوشت میں بیان کیا، جس کو اُس عہد میں بلکہ آج کے وقت میں بھی قابل تحسین نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن ان واقعات کو لکھنے کے لیے لکھنے والے کو بڑی جی داری اور بانکپن کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ جہاں خوبیوں اور خامیوں کے بیان میں آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے، وہاں یاداشت کا بھی امتحان ہوتا ہے، کیونکہ انسانی ذہن اس انداز سے کام کرتا ہے کہ دماغ کے سٹوریج میں وہی باتیں یاد رہ جاتی ہے جن کو وہ یاد رکھنا چاہتا ہے۔ شعوری، لاشعوری یا تحت الشعوری اخفا کے باوجود خود نوشت سوانح نگار کو بہر طور اپنی یاداشت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ چاہے محض یاداشت کا سہارہ لے یا ڈائری کا، جرنل سے کام لے یا نوٹ سے کام لے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کی یاداشت اُسے دھوکہ بھی دے سکتی ہے۔ انسان کا ذہن فراموش ہی نہیں کرتا، چیزوں کی کانٹ چھانٹ بھی کرتا رہتا ہے اور صرف وہی حقائق ہمارے ذہن میں محفوظ رہ جاتے ہیں جنہیں وہ محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اور وقت کی کانٹ چھانٹ کے باوجود انہیں فراموش نہیں کر پاتا۔ جب کوئی شخص اپنی زندگی کے ابتدائی واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ ایسا ہونا کلیتہً ممکن نہیں، اس کی مثال اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو کر سامنے کا منظر نامہ دیکھنا چاہتا ہے۔ ان میں سے کچھ بادلوں میں چھپا ہوا ہے، وہ فاصلہ سے دیکھتا ہے تو اسے کوئی شے یہاں سے دکھائی دیتی ہے، کوئی وہاں سے کہیں زمین کا منظر ہے، کہیں پہاڑ کا یا جنگل کا نظارہ ہے، یا کوئی اونچی چیز ہے جس پر روشنی پڑ رہی ہے، ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ اس طرح خود نوشت سوانح نگار اس شعبے میں پڑھ سکتا ہے کہ وہی چیزیں اس کی زندگی میں اہم تھیں جو اسے یاد رہ گئی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو اس کے ذہن سے کلیتہً محو ہو گئی ہوتی ہیں۔

بعض ناقدین کے مطابق خود نوشت سوانح عمری میں فنکار کی نرگسیت نمایاں ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا نفس سے محرک نرگسیت کو ہی قرار دیتا ہے۔ اس لیے زیادہ تر لکھنے والوں میں اپنی کمزوریوں کو آرٹ بنا کر پیش کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ اردو ادب کی خود نوشت سوانح عمریوں میں ساقی فاروقی کی آپ بیتی کا پہلا حصہ ۲۰۰۸ء میں "اکادمی بازیافت کراچی" نے شائع کیا۔ اس صورت میں شائع ہونے سے پہلے یہ "رسالہ نیا ورق" میں قسط وار شائع ہوتا رہا تھا۔ ساقی فاروقی اپنی بے باکی اور صاف گوئی کی بدولت ایک متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔ ان کی صاف گوئی اور بے تکلفی کی وجہ سے وہ ادبی حلقوں میں مشہور رہے ہیں۔ مشفق خواجہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں

"ساقی فاروقی نے اقبالؔ کے بعد شاعروں میں سے فیضؔ، راشدؔ اور میراجیؔ کو رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیا ہے اور باقی سب شاعروں کو چھوٹ بھئے اور چیڑ قناتی کہہ کر ان کی عزت افزائی کی ہے۔ ترقی پسند شاعروں کے بارے میں فرمایا کہ ان میں سے کسی کے پاس انفرادی لہجہ نہیں ہے۔ یہ سب ایک ہی جیسی باتیں ایک ہی جیسے انداز میں کہتے ہیں۔"۵

اسی طرح جب مختلف ناقدین کی آراء دیکھتے ہیں تو ساقی فاروقی کی بے باکی اور صاف گوئی کے سب قائل نظر آتے ہیں۔۔ خالد احمد ساقی فاروقی کو اردو کا خود کش بمبار کہتے ہیں۔

"He is the suicide bomber of Urdu literature who has survived there was nothing for it but to et the bomber's jacket and pack it with TNT and ball-bearings of honest opinion and walk into the place of a strangely arrested post. 1947 Urdu literature and its classified practitioners"6

ساقی فاروقی کا اسلوب انتہائی خوبصورت اور دلکش ہے۔ سچ بولنے کی جرأت نے ان کی آپ بیتی کو زیادہ تجربہ اور مشاہدہ کا عکاس بنا دیا ہے۔ جیسا کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سوسائیڈ بمبر کی طرح جو کچھ محسوس کرتے ہیں بس داغ دیتے ہیں اور صفحہ قرطاس پر بیان کر دیتے ہیں۔ اس آپ بیتی کی ابتداء ہی میں ان کی شخصیت کی یہ خوبی سامنے آتی ہے، وہ خود نوشت کی ابتداء کچھ یوں کرتے ہیں۔

"سوال یہ ہے کہ آپ بیتی کیوں؟ اور پھر میری آپ بیتی کیوں؟ یہ تو سچ ہے کہ میں نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے اور اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں شاید کچھ زیادہ ہی بھرپور مگر سیکڑوں ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں نے مجھ سے بھی زیادہ بھرپور زندگیاں گزاری ہیں یا گزاری ہونگی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ معدود چند نے ہمیں اپنے تجربات میں شرکت کی اجازت دی، باقیوں نے یا تو ہمیں اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ ہمیں اپنے تجربوں اور مشاہدوں میں شامل ہونے کی دعوت دیتے یا یہ کہ ترتیل Articulation ان کی کنیز غلام نہیں تھی، یا انہوں نے اپنی زندگی کو اتنا اہم نہیں جانا کہ آپ بیتی کے مرتکب ہوتے، یا یہ کہ سچ بولنے کے عذاب سے گزرنا نہیں چاہتے تھے۔ غرض کے آپ بیتی کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ آدمی کو اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگے۔ (یہ بھی مد نظر رہے کہ یہ احساس غلط فہمی پر مبنی بھی ہو سکتا ہے) دوسرا یہ کہ سرد و گرم زمانہ چشیدہ پر یہ حقیقت منکشف ہونے لگی کہ ہر چند اس پر پیغمبری وقت تو نہیں پڑا مگر اس نے پیغمبری عمر کی

سرحد پار کرلی ہے۔"؎

ساقی فاروقی کی خود نوشت آپ بیتی اپنی نوعیت کی انوکھی اور دلچسپ تصنیف ہے۔ مصنف نے اسے یادوں کی بازیافت کہا ہے۔ مختصر دیباچہ ادبی مجلے "مکالمہ" کے مدیر مبین مرزا کا شکریہ ادا کیا گیا ہے، ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ اس خود نوشت کو منظر پر لانے والے بھی یہی لوگ یعنی مبین مرزا، راشد اشرف اور صفات علوی ہیں۔ "پاپ بیتی" کی ترکیب اردو ادب کے عظیم نثار مشتاق احمد یوسفی صاحب کی اس ترکیب سے اشفاق نقوی نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اشفاق نقوی نے اپنی خود نوشت کا نام "پاپ بیتی" رکھا جسے "نیو لائن لاہور" سے شائع کرایا گیا۔ اس کتاب کو اپنے تمام دوستوں اور اپنے تمام دشمنوں کے نام انتساب کیا ہے۔

مغربی ادب میں روسو کی آپ بیتی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس نے اپنی بے لگام زندگی کے بارے میں بڑی بے باکی سے اظہار کیا ہے۔ خود ہمارے ہاں سوانحی ناولوں کے ذریعے زندگی کے کئی ناقابل بیان واقعات کو رنگ آمیزی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ جس کی بہترین مثال ممتاز مفتی کا سوانحی ناول "علی پور کا ایلی" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ بیتی میں مصنف بہت کچھ بیان کر کہ بھی بہت کچھ چھپالیتا ہے۔ اگر وہ بے باکی اور روانی سے سب کچھ بتانے کا دعویٰ بھی کرے تب بھی قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت کچھ چھپا گیا ہے۔ ساقی فاروقی کا معاملہ کچھ مختلف ہے، اللہ نے ان کی ذات میں یہ انفرادیت بخشی کہ وہ بے باکی سے حقیقت کا بیان کرتے ہیں۔ آپ بیتی کی اہم بات بھی یہی ہے کہ فرد پر جو کچھ گزرا ہو اس کا بیان حوصلہ اور جرأت سے کرے، جیسا کہ ساقی فاروقی نے کیا ہے۔ اسے دوسروں کو چھیڑنے میں مزہ آتا ہے۔ اُن کی مثال اس شریر بچے کی ہے جو گلی سے گزرتے ہوئے دوسروں کے چھت کے کانٹے کو اپنے دن کا حاصل سمجھتا ہے۔ وہ خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ زنجیر کا تعاقب کرتے ہیں اور کڑیاں بناتے چلے جاتے ہیں۔ زنجیر کا تعاقب کرتے ہوئے ان کے دل و دماغ میں یادیں تازہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ماں کا وجود ساقی کے لیے ہمیشہ سایہ رحمت رہا ہے، انہوں نے دل کھول کر اس کا اعتراف کیا ہے اور ایسی خوبصورت شکل عطا کی ہے کہ اس کے اسلوب کی تحریری تاثیر کو دگنا کر دیا ہے اور قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"بالکونی پر ہی ایک دوسرے کو گلے لگا لگا کر رونے دھونے کے بعد ہم ننھے منے فلیٹ میں داخل ہوئے۔ یہاں ابا اپنے خاندان سمیت دو سال پہلے منتقل ہوئے۔ ایک زمانے میں اماں خدمتگاروں کی نگاہ داری کیا کرتی تھی۔ مگر ان کے ہاتھ کے

بنے شامی کباب، ساگ گوشت، ماش کی دال اور مٹر قیمہ چینی کے ڈونگوں میں شور مچا رہے تھے کہ یہ سہاگن تو قیامت کی باور چن بن چکی ہے۔ چار گھنٹوں کے اندر اندر ہی ہم چار برسوں سے گزرے۔ حاصل یہ تھا کہ ہندوستان چھوڑتے ہی اماں نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوئی، ابا کراچی پہنچنے کے بعد تقریباً دو سال بیکار رہے، اب ایک فرم میں Medical Representative ہیں۔ اماں کے علاج معالجے اور خاندانی کفالت کے باعث بچھی کچی پونجی داغ مفارقت دے گئی۔ زیورات بیچ بیچ کر ہم دونوں بھائیوں کو آخری سال ہاسٹل میں رکھا گیا۔"۸ے

ساقی فاروقی نے صاف گوئی کے ساتھ اپنی زندگی کے تلخ حالات وواقعات کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح ۱۹۵۴ء کے آخر میں ساقی فاروقی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کرتے ہیں اور اصل نام قاضی شمشاد بھی پس منظر میں چلا جاتا ہے اور مار دھاڑ سے بھرپور ساقی نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ وہ ابتدا ہی سے کلشے کا قائل نہ تھا، اس کی شاعری اور نثر عام پامال راستوں سے الگ تھی۔ کلشے کے خلاف یہ جہاد انتہائی دشوار فیصلہ تھا لیکن ساقی فاروقی کی بنیادی فطرت اور مزاج کا تقاضا ہی یہی تھا کہ اس تقاضے پر لبیک کہتے ہوئے استعارات، الفاظ و محاورات اور اردو شاعری کے روایتی ڈکشن کو قریب نہ آنے دیا۔ اپنی خودنوشت میں بھی اپنی منفرد روش کو برقرار رکھا، امیر ہو یا غریب، بڑا ہو یا چھوٹا، ادیب محقق ہو یا عام آدمی ہر ایک کے بارے میں دوٹوک الفاظ میں رائے دی۔ دوستی اپنی جگہ مگر حق کو حق کہنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔

"انیس اور اقبال، پھر یگانہ اور راشد کے مصرعوں کا صوتیاتی نظام مجھے بہت پسند تھا کہ میرے مزاج سے لگا کھاتا تھا۔ میر کی لہکتی ہوئی اور غالب کی دہکتی ہوئی آواز نے پریشان کر رکھا تھا۔

I mean the better meer and the better Ghalib

اس لئے کہ ان کے ہاں بھی سخنِ فضول کی کمی نہیں"۹ے

ساقی فاروقی کی بے باکی کا یہ حال تھا کہ قریبی دوستوں کے فن پر بات کرتے تو کوئی خاطر ولحاظ ملحوظ نہ رکھتے ۔ جمیل الدین عالی جو اُنہیں بے حد عزیز رکھتے اور خود ساقی بھی ان کے حسن سلوک، شاہ خرچی اور دوستی کے معترف تھے، لیکن جب بات فن پر ہو تو ساقی کا روپ الگ ہو جاتا ہے۔

"خراج اور خوش پوشاک بھی کاشی خرچی اور خوش پوشاکی کی پچھلی ۲۳ سالہ شاعری اور نثر میں بھی نظر آتی۔ ان کی پہلی کتاب مجھے بہت پسند آئی تھی اس کے بعد ان کے ادب کا گراف نیچے ہی کی طرف سرکتا چلا گیا"۱۰ے

ساقی فاروقی کے ہاں شعراء اور معاصرین پر صرف نکتہ چینی کرنا یا صرف خامیاں نکالنا ہی نہیں، بلکہ اکثر انہوں نے اپنے معاصرین شعراء کو دل کھول کر سراہا بھی ہے۔ شمیم احمد اور احمد جمال پانی پتی کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ معاصرین شعراء میں سے پروین شاکر، عبید اللہ علیم اور جمال احسانی کی بے وقت موت نے انہیں بہت اداس کیا اور سلیم احمد کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ یہ منظوم خراج اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ یہ ساقی کی کسی کتاب میں شامل نہیں، بلکہ انہوں نے اسے اپنی خود نوشت کا حصہ بنایا ہے۔ کراچی میں ساقی نے تقریباً تمام اہم شعراء کی صحبت میں وقت گزارا۔ اپنی خود نوشت میں اس وقت کے شعراء اور ادبی محافل کی تاریخ رقم کرتے نظر آتے ہیں۔ ساقی کے مطابق جو باتیں اس نے لکھی ہیں وہ اردو کا کوئی دوسرا ادیب نہیں لکھ پایا۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ اردو کے کے مرحومین اور موجودین ادیبوں میں شاید میں واحد آدمی ہوں جس نے مذہب اور جنس کے مسائل پر بلاخوف و خطر نہایت تفصیل سے خاطر جمعی سے اپنی سوچ بچار کی روشنی میں اپنی آراء کا تحریری اظہار کیا ہے، ورنہ تقریراوفیشنا (واہ کیا اچھا لفظ ایجاد کیا ہے) تو میرے کہیں ہم عصر کراچی، لاہور، دہلی اور بمبئی کے مجلہ خانوں میں (توبہ توبہ زبان سے غلط لفظ نکل گیا کہنا قہوہ خانوں میں چاہتا تھا) مذہب کے بارے میں نازیبا باتیں کرتے رہتے ہیں" اللہ

خود اپنے مسلک کے بارے میں ساقی فاروقی نے کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے نزدیک چونکہ مذہب جنس اور ادب تینوں محاذوں پر ان پر شدید جاہلانہ حملے ہوئے ہیں۔ اس لیے خود نوشت سوانح لکھتے ہوئے یہ موقع ملا کہ اپنے مذہب و مسلک کے بارے میں تمام غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ سب سے پہلے ساقی نے اعتراف کیا کہ انہوں نے مذاہب کا مطالعہ فلسفی کے طور پر نہیں بلکہ ایک سوچنے والے ادیب کی طرح پر کیا ہے۔ یعنی اقرار، انکار اور تشکیک کے بارے میں ان کا رویہ صرف اور صرف فکری نہیں ہے بلکہ جبلی بھی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مغرب ہو کہ مشرق، شمال ہو کہ جنوب، جب جہاں اور جس صدی میں بھی کسی نے آزادی خیال کیا ہے، بنیاد پرست اور جگر جلے کتے ان پر بھونکتے رہے ہیں۔ یہ قافلے ہمیشہ چلتے رہے ہیں اور اگر کہیں کسی وجہ سے رک جاتے تو ہم آج بھی پتھر کے زمانے میں جی رہے ہوتے۔ نہ آریائی، برہمن گوتم کے ریلے کو روک سکے، نہ فطرت پرست حضرت موسیٰؑ کے سیلاب کو ناموسائی یہودی حضرت عیسی علیہ السلام کی آندھی کو روک سکے۔ نہ عیسائی اور یہودی محمدؐ کی طوفان کو روک سکے۔ اس لیے کہ ایک کے بعد آنے والا

پہلے سے زیادہ روشن خیال تھا، اس لئے کہ زمانے ترقی کرتے گئے اور ان کے ماننے والے مذہبی جنونیوں کے لئے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ ذرائع ابلاغ نے ساقی فاروقی کو ملعون سلمان رشدی سے جوڑنے کی اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہاہے کہ وہ سلمان رشدی سے کبھی نہیں ملے اور ان کی مذمت کرتے ہیں کوئی انسان اور مسلمان کیا یہ کر سکتا ہے کہ اس ملعون سے ملاقات کرے۔

اب بیتی کو پڑھتے ہوئے ساقی فاروقی کی زندگی سے وابستہ ایک دلچسپ واقعہ سامنے آتا ہے کہ کسی زمانے میں ساقی افسانہ نگار بنناچاہتے تھے مگر ان کے لکھے ہوئے افسانے چوری ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد چوری کرنے والے شخص نے افسانے لوٹانے کا عندیہ دیالیکن اب ساقی فاروقی کے لیے ان میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی کیونکہ بیس سال پہلے لکھے ہوئے افسانوں سے تعلق جوڑنا بھی ان کے لئے ایک مشکل امر تھا۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۳ء تک کراچی میں رہے اور تقریباً ادبی تربیت اسی شہر میں ہوئی۔ ۱۹۵۵ء سے ان کی شاعری امروز، لیل لانہار اور ساقی، جنگ وغیرہ میں چھپتی رہی۔ اس زمانے میں انہوں نے ریڈیو کے لیے گیت اور نغمے بھی لکھے اور بچوں کے لیے بھی عمدہ شاعری کی۔

خودنوشت کا آخری حصہ فیض احمد فیضؔ اور ن م راشدؔ کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں فیضؔ کی موت پر پڑھے جانے والے تاثرات بھی شامل ہیں۔ فیض احمد فیضؔ سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیاہے۔ ن م راشدؔ سے بھی قربت کا بیان ملتاہے، وہ انکی موت پر ان کے گھر والوں کے سرد مہر رویے پر الجھن کا شکار ہوتے ہیں۔ ساقی فاروقی کی آپ بیتی میں اسلوبیاتی حوالے سے طنز و مزاح کی چاشنی نظر آتی ہے۔ آپ بیتی کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے ایک عمر گزاری ہے اور اس کی قیمت ادا کی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ خودنوشت اردو میں ایک اہم اضافہ ہی نہیں بلکہ ایک منفرد شخص کی انفرادیت پر دال ہے۔

حوالہ جات

۱۔ پرویز پروازی، پروفیسر، پس نوشت—اردو کی اہم خودنوشتوں کا جائزہ، کاغذی پیرہن لاہور،

۲۰۰۳ء، ص ۷

۲۔ https://www.britannica.com/art/autobiography-literature

۳۔ سید احمد دہلوی، فرنگ آصفیہ جلد سوم، پاکستان مکتبہ حسن ہیل لمٹڈ لاہور، س ن، ص ۱۱۷

۴۔ پرویز پروازی، پروفیسر، پس نوشت۔اردو کی اہم خود نوشتوں کا جائزہ، کاغذی پیرہن لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵

۵۔ مشفق خواجہ، خامہ بگوش کے قلم سے، پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۶۲

۶۔ خالد احمد، ڈیلی ٹائمز، ۲۷ اپریل ۲۰۰۸ء

۷۔ ساقی فاروقی، آپ بیتی پاپ بیتی، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۶۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۹۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۰